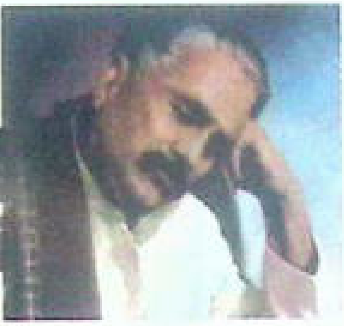
اختر و اقبال

تضمین بر کلام اقبال





سیدہ اختر حیدر آبادی

(۱۹۱۰ء-۱۹۷۳ء)

ترتیب و تقدیم

ڈاکٹر معین الدین عقیل

اشاعت اول: ۱۹۴۸ء، نسیم بک ڈپو لکھنؤ

اشاعت جدید: ۲۰۱۶ء

بسم الله الرحمن الرحيم

اختر و اقبال

یعنی کلامِ اقبال کی تضمینوں کا نادر و منفرد مجموعہ

اشاعتِ اوّل: ۱۹۳۸ء، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ

اشاعتِ جدید: ۲۰۱۷ء

سیّدہ اختر حیدرآبادی

(۱۹۱۰ء–۱۹۷۳ء)

تقدیم

ڈاکٹر سید معین الدین عقیل

دار النعمان پبلشرز
DARUN NOMAN
PUBLISHERS

اختر و اقبال، سیدہ اختر حیدر آبادی
ترتیب و تدوین جدید، ڈاکٹر سید معین الدین عقیل
لاہور: دار النعمان، مارچ ۲۰۱۷ء، 106 صفحات
۱- اقبالیات، پاکستانیات، شاعری
۲- شاعری، تضمین
۳- ہندوستان- لکھنو

سلسلہ اشاعت (17)

AKHTAR O IQBAL / SYEDA AKHTAR HAYDERABADI
ISHAT E JADEED : DARUL NAUMAN, LAHORE
MARCH 2017, PP 106, SERIES OF PUBLICATION (17)

سرورق و اہتمام: اویس سہروردی، اورینٹل پبلی کیشنز۔
طبع اول: مارچ ۲۰۱۷ء
ناشر: دار النعمان، لاہور
طابع: مقصود احمد
قیمت: ۳۰۰ روپے
دست یابی کا پتا: دار النعمان، پاکستان
بادیہ علیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ، دکان نمبر 4، اردو بازار، لاہور
صوتی رابطہ: +92-333-1206301
کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور



خطیبۂ ہند - سیدہ اختر

فروری ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے جلسے میں جو پٹیالہ میں منعقد ہوا اس میں خطیبۂ ہند و جوہرِ سخن سیدہ بیگم سردار اختر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ بعد میں وہ "کل ہند زنانہ مسلم لیگ" کی صدر بھی نامزد ہوئیں۔
آپ ایک نامور خطیبہ کے علاوہ نثر نگار اور پرگو شاعرہ بھی تھیں۔

اقبال کی ایک پرستار

سیّدہ اختر حیدرآبادی

ایک تعارف

ڈاکٹر معین الدین عقیل

کلام اقبال کی مقبولیت خود ان کے اپنے زمانے میں ایک مثالی حیثیت اختیار کر چکی تھی کہ اس کے مظاہر اور اس کی مثالیں، بالخصوص اقبال کی ملی اور قومی موضوعات پر تحریر کردہ نظموں کے تعلق سے، متنوع ہیں اور مسلمانانِ جنوبی ایشیا کی سیاسی اور قومی تحریکوں کے فروغ اور سیاسی اور سماجی بیداری کے عرصے میں تو اقبال کی نظمیں ان تحریکوں اور جذبات و احساسات کا سہارا بنی رہی ہیں۔ اس ضمن میں کم از کم، بل کہ محض ایک نظم ''شکوہ'' اور ساتھ ہی ''جواب شکوہ'' کی مثال کافی ہے.... جس کے زیر اثر بھی اور ردعمل اور جوابات میں بھی متعدد نظمیں لکھی گئیں۔[1]

یہ کلام اقبال کی مقبولیت ہی تھی کہ جس کے نہ صرف موضوعات و مضامین نے مسلم عوام کو متاثر کیا اور اپنی جانب کھینچا بل کہ ساتھ ہی ساتھ اس کے اُسلوب اور لب و لہجے نے عام شاعروں کو بھی متاثر کیا اور یہی نہیں بل کہ انھیں کلامِ اقبال کی مختلف

صورتوں میں اور متنوع ہیئت میں تضمینیں لکھنے پر بھی آمادہ کر دیا۔ چناں چہ اقبال کے اُسلوب اور لب و لہجے کو، خصوصاً معاصر شعراء نے، اس طور پر اختیار کرنے کی کوشش کی کہ جو موضوعات ہی نہیں، پیرایۂ اظہار، لب و لہجے اور ہیئت سے بڑھ کر طباعت کے لحاظ سے بھی شعری مجموعوں کے اس صوری انداز اور جسامت میں بھی نظر آیا جس کے مطابق اقبال کے شعری مجموعے چھپتے رہے۔ یعنی متعدد شعراء نے اُسلوب اور لب و لہجے اور موضوعات ہی نہیں اپنے مجموعوں کی طباعت اور ان کے صوری حسن کو وہی انداز دینے کی کوشش کی، جو اقبال کے شعری مجموعے ''بانگ درا''، ''بال جبریل''، ''ضرب کلیم''، ''پیام مشرق'' اور ''ارمغان حجاز'' وغیرہ کا رہا۔

تضمیناتِ اقبال کے ضمن میں محققینِ اقبال کے لیے یہ ایک بڑا موضوعی مطالعہ و تحقیق ہے کہ اقبال کے اپنے عہد سے اب تک اقبال کا کلام یا اس کی جزئیات نے کن کن شاعروں کو اور کس مرتبے کے شاعروں کو ان پر تضمین لکھنے پر آمادہ یا مجبور کر دیا اور ایسی تضمینات کی نوعیت، ہیئت اور معیار کیا رہا؟[۲] اس حوالے سے، تخلیقی سطح پر ایک نمایاں اور منتخب مثال اقبال کی ایک قریبی معاصر اور بل کہ ایک پرستار سیدہ اختر حیدر آبادی کی ہے، جن کی تخلیق کردہ تضمیناتِ اقبال کا ایک مکمل مجموعہ: ''اختر و اقبال، یعنی تضمین بر کلام اقبال'' ۱۹۴۸ء میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع بھی ہوا تھا۔

''اختر و اقبال'' کو نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا لیکن یہ مجموعہ اب نادر و کمیاب ہے اور راقم الحروف کو ''ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز'' (ٹوکیو، جاپان) کے مرکزی کتب خانے میں دستیاب ہوا تھا۔ اس نسخے کو سیدہ اختر نے ممتاز

محقق سید نصیر الدین ہاشمی کو مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو اپنے دستخط کے ساتھ تحفتہً پیش کیا تھا اور اپنا یہ شعر تحریر کیا تھا:

سجدۂ باطل وفریب میرے لیے ہے ناروا

بس یہی ایک ہے ادا میرے سرِنیاز میں

یہ مجموعہ بہ اہتمام ''زہرۂ سخن اکاڈیمی''، فردوس اختر، ٹپکا پور (کان پور) اور ''زہرۂ سخن اکاڈیمی'' سبزہ زار اختر، السور (بنگلور) مرتب ہوا تھا۔ اس مجموعے پر سیدہ اختر کے نام کے ساتھ ''زہرۂ سخن''[۳]، ''ناہید سخن'' اور ''خطیبۂ ہند'' لکھا ہونا ان کی سماجی مقبولیت اور سرگرمیوں کا ایک مظہر ہے۔ ''خطیبۂ ہند'' کا خطاب انھیں مولانا عبدالحامد بدایونی نے ۱۹۳۷ء میں صوبائی مسلم لیگ کے ایک جلسے میں ان کی ایک تقریر سن کر دیا تھا۔[۴]

معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ اختر نے بھرپور ادبی اور سماجی زندگی گزاری ہے۔ بحیثیت شاعرہ اور سماجی وسیاسی کارکن وہ بہت نمایاں اور ممتاز رہیں اور سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھیں۔ اولاً علامہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک میں شامل ہوئیں پھر مسلم لیگ کی تحریکوں میں شمولیت اختیار کر کے نمایاں سرگرمی دکھائی۔ ان کا پیدائشی نام سیدہ نواب سردار بیگم تھا، لیکن سیدہ اختر حیدرآبادی کے نام سے معروف ہوئیں۔ ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا، لیکن ان کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد دکن میں ہوئی[۵]، چناں چہ وہ اپنے نام کے ساتھ حیدرآبادی بھی لکھتی رہیں[۶]۔ آباواجداد کا تعلق اودھ سے تھا لیکن وہ ریاست حیدرآباد میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے والد کا

نام سید امیر حسن (متوفی ۱۹۲۲ء) تھا اور دادا سید کریم حسن قمر لکھنوی تھے، جو شاعر تھے اور داغ دہلوی سے انھیں تلمذ حاصل تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی تربیت کا انتظام اور ذمہ داری ان کے چچا محبوب علی نے نباہی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ خطابت میں بھی ممتاز رہیں، جو مذکورہ صدر خطاب، ''خطیبۂ ہند'' سے بھی ظاہر ہے۔ سماجی سرگرمیوں کے ذیل میں وہ سول ڈیفنس کونسل کی بھی رکن رہیں اور قومی و سیاسی سرگرمیوں کے تحت ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کی سنٹرل سب کمیٹی کی رکن منتخب ہوتی رہیں ،اور بالآخر ''زنانہ مسلم لیگ'' کی صدر بھی نامزد ہوئیں ۸ ۔ان کی شادی خان بہادر عبدالغنی، گورنمنٹ آرمی کنٹریکٹر اور مالک فرم شمس الدین اینڈ سنز، رئیس نصیر آباد، راجپوتانہ، مقیم کانپور سے ہوئی تھی، جو با اثر اور ذی حیثیت تھے۔ ان کے ساتھ بیگم اختر نے مشرق بعید کا سفر بھی کیا۔ کانپور سے منتقل ہو کر ان کے شوہر نے بنگلور میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں بیگم اختر نے ۲؍اکتوبر ۱۹۷۳ء کو انتقال کیا ۹ ۔شوہر کی سماجی حیثیت کے سبب بیگم اختر کے روابط معروف و ممتاز شعراء و نقادوں سے استوار تھے، جن کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کے مجموعے ''اختر و اقبال'' کے آغاز میں ان کی شخصیت و شاعری کے بارے میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، نیاز فتح پوری، ماہر القادری، سیماب اکبر آبادی وغیرہ کی آراء شامل ہیں۔ چوں کہ ان اکابر ادب کی آراء غیر مدون ہیں اور توجہ کی مستحق ہیں، اس لیے ان میں سے جوش، جگر اور ماہر کی تحریروں کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

''اختر و اقبال'' میں شامل تضمینات اقبال کے علاوہ بیگم اختر کی اقبال سے

جذباتی نسبت کو دیگر صورتوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مملکت حیدر آباد میں اقبال کے ستائش و مطالعے کے لیے قائم "بزمِ اقبال" کی شاخ واقع رائچور نے ۱۹۴۶ء میں ایک ہفتۂ اقبال کا اہتمام کیا اور ۱۱ رمئی کو اہم تقریبات کا اہتمام کیا جس میں مقامی اور دور دراز سے مدعو کیے گئے متعدد مہمان و اکابر نے شرکت کی۔ بیگم اختر کو بھی ان تقریبات میں مدعو کیا گیا تھا، جس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی ان کے سپرد کی گئی تھی۔ اپنے صدارتی خطاب میں بیگم اختر نے کہا:

> "اقبال اور ان کے بارے میں اتنا لکھا جا چکا ہے کہ شاید ہندوستان میں یہ شرف بلند کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہوا ہو۔ اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں بے شمار مقالے اور کتابیں منصۂ وجود میں آ چکی ہیں۔ اقبال نے اسلام کی تعلیمات میں جدید روح پھونکی ہے۔ اس کا فلسفۂ تدبیر انسان کی تدبیر اور اس کی کامیابی کے تمام امکانات پر حاوی ہے۔ وہ ایک ایک نقطۂ حیات کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ ہندوستان کا جذبۂ بقا دراصل نتیجہ ہے اس تصادم کا جو انگریزی اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گذشتہ چھ سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں بلکہ فکری اور ذہنی بھی ہے۔ اقبال کا کلام ہر گھر میں ہونا چاہیے تاکہ ہماری نئی نسل اس کو پڑھے اور قومی مستقبل تابناک ہو" ۱۰۔

بیگم اختر کو شاعری سے عمر بھر شغل رہا۔ دو شعری مجموعے: "صحیفۂ درخشاں" اور "اختر و اقبال، بر تضمین کلام اقبال" ان سے یادگار ہیں۔ مؤخر الذکر تمام تر کلام اقبال

کی تضامین پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ اختر شاعری میں نظم کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس مجموعے کے تمام مشمولات نظم میں ہیں، پھر ان نظموں کی ہیئت بھی زیادہ تر مخمس میں ہے یا پھر کچھ مسدس یا رباعی میں ہیں۔ شاعرہ کو فارسی زبان میں بھی درک تھا۔ چناں چہ اقبال کے فارسی کلام پر بھی تضمینیں لکھی ہیں اور بعض منظومات اور ان کے اجزا بھی فارسی میں تخلیق کیے ہیں۔ تضامین میں جہاں سیدہ اختر نے اقبال کے مصرعے استعمال کیے ہیں، وہیں کچھ کوشش اقبال کے اُسلوب کو اختیار کرنے میں بھی نظر آتی ہے اور کہیں عنوانات بھی اقبال کے مصرعوں یا تراکیب سے اخذ کیے ہیں۔ یہ مجموعہ کل ۳۳ منظومات پر مشتمل ہے۔ یہ عنوانات درج ذیل ہیں: ''مناجات''، ''آہ دلی''، ''ناز و نیاز''، ''تمنائے انجم''، ''بارگاہِ شہود''، ''نورِ مطلق''، ''مجذوباتِ شیخ''، ''حرم و دیر''، ''گدازِ دل''، ''نغمۂ داؤد''، ''نغمہ ہائے الست''، ''زخم کرم''، ''مرگِ خودی''، ''شکر و قند''، ''مناصبِ حیات''، ''سحر''، ''صبح کا تارا''، ''حکومت''، ''علم و دین''، ''پیرِ حرم سے''، ''اشارۂ فطرت''، ''کارگہِ شیشہ گراں''، ''قندِ مکرر''، ''لوحِ قرآنی''، ''فکرِ راہ''، ''نوائے سوز''، ''مرغ نوا طراز''، ''شاعر اور حور''، ''نئے دور کا آغاز''، ''فرمانِ ابلیس''، ''ماہِ تمام''۔ منظومات میں دو نظمیں ''اختر و اقبال'' اور ''سیدہ اختر و اقبال'' بھی شامل ہیں۔ مگر ان دو عنوانات کا جواز بظاہر واضح نہیں ہے۔ بیگم اختر کے کلام کا ایک نمائندہ انتخاب۔ لک رام نے ''تذکرۂ معاصرین'' میں دیا ہے۔ [۱۱]

حواشی

۱۔ جن کا ایک نمائندہ انتخاب تقام حسین جعفری کے مرتبہ مجموعے: ''شکوہ اور جواب شکوہ'' مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ اس ضمن میں ایک مثالی اور جامع کاوش کا نمونہ بصیرہ عنبریں نے پیش کیا ہے: ''تفصیلاتِ اقبال'' مطبوعہ لاہور ۲۰۰۷ء۔

۳۔ ''زہرہ سخن'' کا خطاب انھیں سیماب اکبر آبادی نے ۹ نومبر ۱۹۳۲ء کو اردو کانفرنس و مشاعرہ، منعقدہ بنگلور کے جلسے میں دیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ تھے: ''اگر میں ریاست میسور کا فرماں روا ہوتا تو (اس کانفرنس و مشاعرے کے انعقاد پر) آج اختر صاحبہ کو اپنی حکومت کی طرف سے ... ''زہرہ سخن'' کا تابناک خطاب دیتا، جس کی وہ حقیقی معنوں میں مستحق ہیں...'' سیماب اکبر آبادی، مشمولہ: ''اختر و اقبال'' ص ۸۔

۴۔ محمد جمیل احمد ''تذکرہ شاعرات ہند''، بریلی، ۱۹۴۳ء، ص ۲۲۱۔

۵۔ نجمی، فصیح الدین، ''نسوانِ ہند''، پٹنہ، س ن، ص ۱۳۸؛ لیکن مالک رام نے تاریخ پیدائش ۹ مارچ 1918ء تحریر کی ہے۔ مالک رام، ''تذکرۂ معاصرین''، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2010ء، ص ۱۰۲۔

۶۔ ایضاً، و نیز محمد جمیل احمد، تصنیف مذکورہ، ص ۲۲۱

۷۔ سرفراز حسین مرزا Muslim Women's Role in Pakistan Movement، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ص ۳۲، ۵۵، ۶۳۔

۸۔ بحوالہ: جوش ملیح آبادی، ''ناہید سخن''، مشمولہ: ''اختر و اقبال''، ص ۹۔

۹۔ مالک رام، تصنیف مذکورہ، ص ۱۰۲۔

۱۰۔ عبدالرؤف عروج، ''اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد دکن''، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ص ۱۳۰،

۱۳۹: رات کے دو بجے سیدہ اختر صدارتی تقریر کے لیے کرسی صدارت سے اُٹھ کر مائیک پر تشریف لائیں۔ پورا لان ''خطیبۂ ہند، زندہ باد اور زہرہ سخن زندہ باد'' کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ عوام ان کی انقلابی نظموں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سیدہ اختر کی شاعری نے ملک کے نوجوانوں میں کس طرح بیداری کی لہر پیدا کی ہے۔ ایضاً ص ۱۳۹۔

۱۱ ص ص ۱۰۳۔۱۰۴

☆☆☆☆

اختر و اقبال

فہرست

عنوان	مصرع	صفحہ
سر راہے	سیدہ اختر	۲۱
ناہید سخن	جوش ملیح آبادی	۲۳
کلام اختر	جگر مرادآبادی	۲۵
کلام اختر کی روانی وسادگی	ماہر القادری	۲۹
زمانہ حاضر کی بہترین شاعرہ	دور ہاشمی	۳۱
زہرہ سخن	سیماب اکبرآبادی	۳۲
پیش لفظ	نیاز فتحپوری	۳۴
مناجات	چمن کا دیوانہ حادثات خزاں کے صدمات سہ رہا تھا	۳۵
آہ و تی	داستانِ عظمت اسلام یاں خوابیدہ ہے	۳۷
ناز و نیاز	لٹا کے سرمایہ خودی کو زمانے میں سرفراز ہو جا	۳۹
تمنائے انجم	غیر ممکن ہے بلندی نظر کو چھوڑ دوں	۴۱
اختر و اقبال	یہ مانا یوں تو ہے ساری زمیں سارا جہاں اپنا	۴۳
بارگاہ شہود	خبر نہیں ترے آہن پہ چڑھ گیا کیوں زنگ	۴۵
نور مطلق	مژدہ بادا کہ کنوں دیدہ ورے پیدا شد	۴۷
مجذوبات شیخ	کہتے ہیں کچھ، یہ عہد فقط زیر و بم کا ہے	۴۹

حرم و دیر	خدا رکھے جمالِ عارضِ جاناں کی زیبائی	۵۲
گدازِ دل	جس میں نہ ہو گداز تو وہ دل نہ کر قبول	۵۴
نغمۂ داؤد	یہ کس نے آج سجائی ہے بارگاہِ وجود	۵۶
نغمہ ہائے الست	یہ آج چھیڑ دیے کس نے نغمہ ہائے الست	۵۹
زخمِ کرم	تجھ سے زیادہ رمز داں کون ہے یاں سخن سرا	۶۱
مرگِ خودی	خودی کی موت سے اخلاق کا ہے شیشہ چور	۶۴
شکر و قند	یوں تو نظر آتے ہیں پرستارِ خدا بھی	۶۶
مناصبِ حیات	اب اس کے ساز میں باقی نہیں کوئی آہنگ	۶۸
سحر	یہ سحر جس کا ہر اک لمحہ ہے رشکِ نوروز	۷۰
صبح کا تارا	اسی نگہ کو میسر ہے حق کا نظارہ	۷۱
حکومت	دیں کو اپنے نہ کبھی اُٹھ کے سنوارا لیکن	۷۳
علم و دین	نہ پوچھ مدرسہ و خانقاہ کی تعلیم	۷۵
پیرِ حرم سے	دیکھو جسے لیلائے فرنگی کا ہے مجنوں	۷۷
اشارۂ فطرت	یہ ہر ایک لحظہ فطرت تجھے کرتی ہے اشارہ	۷۹
کارگرِ شیشہ گراں	شمع پر جل بجھا پروانہ پر اُٹھا نہ دھواں	۸۱
قندِ مکرر	اک رازِ محبت تھا جو کہہ گیا دیوانہ	۸۳
روحِ قرآنی	وہی جو رکھتا ہے بادہ نہ جام رکھتا ہے	۸۵
فکرِ راہ	نہیں طلب ہی تجھے فکرِ راہ کیوں ہوتی	۸۸
نوائے سوز	بتاؤں کیا کہ مسلط ہے مجھ پہ کون سا غم	۹۰
مرغِ نوا طراز	اے کہ حیات بخش ہے میرے لیے تری صدا	۹۲

شاعر اور حور	مری سمت کیوں نہیں ہے ترا التفات شاعر	۹۴
نئے دور کا آغاز	اوروں کی طرح میں بھی ہوں گمراہ ولیکن	۹۷
سیدہ اختر و اقبال	تجسس کے رنگین نشاں اور بھی ہیں	۹۸
فرمان ابلیس	لاؤ ہر ایک جلوہ کو ظلمت کے بیچ میں	۱۰۱
ماہ تمام	کیا کہوں تجھ سے کہ کیا ہے مرے دل کا عالم	۱۰۳

سر راہے

غالب نے سچ کہا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رُسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

"اختر و اقبال" کا مطالعہ ہر اہلِ نظر کے لیے ناگزیر ہے کیوں کہ "کلامِ اقبال" اپنے اندر لا انتہا بصیرتیں اور رہنمائیاں رکھتا ہے۔ غالبؔ علیہ الرحمۃ کا مندرجہ بالا شعر پڑھیے اور ----- اسی کے ساتھ اپنے ضمیر و ایمان کو زندہ رکھنے کے لیے یہ شعر ہمیشہ وردِ زبان رکھیے۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
(مولانا ظفر علی خاں)

سیدہ اختر

ناہید سخن

خطیبۂ ہند، ناہیدۂ سخن سیّدہ اختر، صدر ''آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ'' کو میں ان کے بچپن سے جانتا ہوں اور میں ان کا ایک دیرینہ نیاز مند ہوں اور ان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ ادب کے اُفق پر ستارہ بن کر طلوع نہیں ہوئی تھیں۔

اختر کے اندر ایک ایسی بے تاب رُوح کارفرما ہے جو عورتوں میں تو کیا ہزاروں مردوں میں بھی نہیں پائی جاتی اور ان کے جذبات اس قدر بلند و تیز ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، نپولین کی روح ان کے اندر حلول کیے ہوئے ہے۔

وہ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ قومی خدمات کا بھی شدید جذبہ رکھتی ہیں اور جب کسی کام کا بیڑا اُٹھاتی ہیں تو اُسے انجام دیے بغیر دَم نہیں لیتیں۔ ایک عورت ہو کر وہ خدمتِ خلق کے معاملات میں شدید سے شدید محنت کرتی ہیں لیکن تھکتی نہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔

اختر صاحبہ کی شاعری میں تصنع مطلق نہیں پایا جاتا۔ وہ جو کچھ بھی محسوس کرتی ہیں اس کو شعر کا پیکر دے دیتی ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ غزل کہتے ہیں وہ نظم نہیں کہہ سکتے اور جو نظم پر قادر ہوتے ہیں انھیں نثر پر قدرت نہیں ہوتی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اختر صاحبہ غزل، نظم اور نثر ان تینوں اصناف پر قادر ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک خاص دل کش اور کام کی صفت اُن میں اور بھی ہے یعنی وہ ایک نہایت

شیریں بیان اور جذبات انگیز خطیبہ بھی ہیں اور خطابت کے وقت اُن کے الفاظ کی روانی، چہرے کی شگفتگی، آنکھوں کی شعلہ پرور چمک اور لہجے کا پُر جوش بہاؤ سامعین کو ایک دوسرے عالم میں لے جاتا ہے۔

موصوفہ کا دل کش کلام ''اخترؔ و اقبالؔ'' (تضمین بر کلام اقبالؔ) آپ کے سامنے ہے۔ اسے ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ اس شاعرۂ نادرہ گفتار کے قلم نے رنگینیوں اور لطافتوں کے کیسے کیسے دریا بہائے ہیں اور اخترؔ کے سینے میں کتنے جواہر جگمگا رہے ہیں۔

مجھے قوی اُمید ہے کہ ہندوستان کے اربابِ ادب اس صحیفہ درخشاں کو سر آنکھوں پر لیں گے اور اُن کے آسمان شاعری پر یہ نجم درخشاں جو طلوع ہوا ہے اس کے نظارے سے اپنی آنکھوں کو روشن کریں گے۔

جوشؔ (ملیح آبادی)

بصد ہزار عجلت

کلامِ اختر

موجودہ اُردو شعر و ادب نہایت ہی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ مغربی استیلا و تسلط نے ہماری داخلی شاعری کا رُخ قطعاً یا زیادہ سے زیادہ خارجی شاعری کی جانب پھیر دیا ہے۔ کتنی ہی عمدہ حسن کی شرح و تفصیل کرتے جایئے، حسن باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے اشارہ و کنایہ شعر کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ جب کوئی قوم اپنی خصوصیات سے ابا کرنے لگے اور دوسری اقوام کی اندھا دُھند تقلید تو اندازہ کیجیے کہ وہ قوم ہلاکت کی طرف جارہی ہے یا زندگی کی جانب؟

یاد رکھیے! آپ کی زندگی آپ کی خصوصیاتِ ملّی و ملکی میں ہے نہ کہ تقلید و تائید میں۔ ایک بین الاقوامی کریٹک (Critic) بہت آسانی کے ساتھ آپ کے شعر و ادب کا تجزیہ کر کے بتا دے گا کہ آپ کے شعر و ادب میں کہاں تک آپ کی انفرادیت ہے اور کہاں تک دوسروں کی۔ آپ کا شعر و ادب زبان کے اعتبار سے آپ کا سہی لیکن اندازِ بیان خیالات و جذبات کے اعتبار سے آپ کا نہیں بل کہ اُس قوم یا اقوام کا ہے جن کے آپ ''ہز ماسٹر وائس'' بنے ہوئے ہیں یا بنتے جا رہے ہیں۔

ہماری جماعتِ ناقدین کو بے حد وسعتِ فکر و نظر کے ساتھ گرم و سرد ممالک کے اثرات کے ماتحت مشرقی و مغربی شعرا کا مزاج دریافت کرنا چاہیے! اور شعر و ادب کے متعلق ایک صراطِ مستقیم قوم و ملک کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ

زیادہ تحلیل و تفصیل سے بحث کی جائے۔

اس قدر اجمال و تفصیل یا تمہید کے بعد اصل موضوع یعنی خطیبہ ہند، زہرہ سخن سیدہ نواب سردار بیگم صاحب اختر کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

شعر حقیقتاً شاعر کی ظاہر و باطن صورت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر آپ دیکھ سکتے ہیں تو اس آئینہ میں شاعر کا ایک ایک خدوخال واضح طور پر نظر آ جائے گا۔ تمام ادبی دنیا میں عام طور پر یوپی (اُتر پردیش، انڈیا) کی دنیا میں خاص طور پر بیگم صاحبہ سیدہ اختر کی شخصیت نہایت درجہ نمایاں اور باوقعت ہے۔ آپ کی سیاسی، ادبی، مذہبی اور قومی سرگرمیاں شاہد ہیں کہ آپ نے ہر موقع پر ایک غیر فانی شجاعت، عزت، بہادری، خودداری کا ثبوت دیا ہے، جو قابلِ تحسین و آفریں ہی نہیں قابلِ رشک بھی ہے۔ موصوفہ نہایت ہی شریف، نڈر، پاکیزہ اخلاق، باعصمت خاتون ہیں۔ گویا صحیح معنوں میں ”مشرقی خاتون“۔

شعر و ادب کی تعریف میں دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ اور پھر بھی شعر و ادب اپنی جگہ اسی طرح تشنۂ تعریف ہے:

”گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد“

رد و قبول کا معیار طلسمِ وہم سے زیادہ کچھ نہیں۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

نور و ظلمت اعتباری سہی لیکن اس میں تو شک نہیں کہ یہ وہمِ اعتبار یا اعتبارِ وہم ہی

ہے، جس نے ایک کائناتِ حسن و جمال ہمارے سامنے لا کر کھڑی کر دی ہے۔ رَدو قبول کا معیار بھی اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ظلمت و نور کی تقسیم!

میں صنفِ نازک کو شاعر کے لباس میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ خود ایک شعرِ مجسم ہے، ایک نغمہ سراپا۔ اس کی شعریت جسے حقیقت میں شعریت کہا جاتا ہے اُس کی عظمت و پاکیزگی میں ہے۔ حسن عبارت ہے تناسبِ اعضا سے لیکن اگر تناسبِ باطنی بھی شامل ہو جائے تو یہ ایک ایسی قوت بن سکتا ہے جس سے اگر صحیح معنوں میں کام لیا جائے تو دنیا زیر و زبر ہو سکتی ہے۔ صنفِ نازک کی مثال ایک نہایت ہی نازک پھول سے دی جا سکتی ہے اگر آپ اس کی حیات جمال تا دیر دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ اسے چھوئیے نہیں۔ اسے زیادہ گہری نگاہوں سے نہ دیکھیے ورنہ جلد وہ اپنی عمرِ طبعی کھو بیٹھے گی، اور اس وقت آپ یا تو ایک بُوالہوس کی طرح اس کے اَوراقِ پریشان کو پامال کرتے ہوئے گزر جائیں گے یا پھر آپ کو تمام زندگی قدرت کے ایک عطیہ یعنی مسرت سے کنارہ کش ہو کر اس کے دوسرے عطیہ غم ہی تک محدود رہ جانا پڑے گا۔ عورت شعر و نغمہ کی قوتوں کا مقابلہ کرنے میں اکثر و بیشتر اپنی خصوصیات کو بھول بیٹھتی ہے۔ بجز استثنا کے بہت کم مثالیں ایسی مل سکیں گی کہ عورت شاعرہ یا مغنیہ بن کر اپنی حقیقی شرافت و عظمت، عصمت و جرأت کو برقرار رکھ سکے۔

جہاں تک مجھے علم ہے خطیبۂ ہند، زہرہ سخن سیدہ اختر اُن مغتنم ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے مغربی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مشرقی خصوصیات کو اپنی جگہ قائم و دائم رکھا۔

میں نے اختر صاحبہ کو دیکھا ہے اور انھیں جانتا ہوں۔ انھیں کی زبانی اُن کے

اشعار، اُن کے مضامین تازہ بہ تازہ اکثر مشاعروں اور کانفرنسوں میں سنے ہیں۔ میں اپنے پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ موصوفہ نہایت درجہ پاک طبیعت و استعداد لے کر آئی ہیں۔ موصوفہ نہ صرف نظم نگاری و غزل گوئی پر پوری قدرت رکھتی ہیں بلکہ نثر میں بھی اُن کے مضامین کا معیار فکر و نظر بہت بلند اور وسیع ہے۔ وہ صرف قافیہ اور ردیف کی تعریف نہیں کرتیں بلکہ حقیقتاً وارداتِ قلبیہ ہوتی ہیں جو قوائے شعریہ سے متصل ہو کر از خود صورت شعری اختیار کر لیتی ہیں۔

دَورِ حاضرہ میں شعرا کی بہتات وبا کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ مبتدیوں کو چھوڑیے اساتذہ کی زندگی اور ان کے شعر و ادب کو جانچیے! آپ کو شاید ہی کچھ حضرات ایسے مل سکیں گے جن کی زندگی اور جن کے شعر و ادب میں کوئی تناقص اور تضاد نہ پایا جائے! اختر صاحبہ کے لیے یہ شرف کچھ کم نہیں کہ ان کی زندگی اور ان کے شعر و ادب میں بڑی حد تک یک رنگی و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی ہی زندگی پیدا کر سکتی ہے اگر شاعر کے شعر و ادب میں شاعر کی زندگی موجود ہو تو وہ کبھی فنا نہ ہو سکیں گے اور اگر ایسا نہیں تو ممکن ہے محض کمال کی بنا پر کچھ خصوصیات باقی رہ جائیں ورنہ حقیقت میں جس کا نام زندگی ہے وہ کہاں؟

سیدہ اختر و اقبالؔ (تضمین بر کلام اقبالؔ) آپ کے سامنے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان کے کلام سے میرے بیان کی خود ہی تصدیق کر لیں گے۔ میں شعر و ادب کو نقد و نظر کے ماتحت نہ مجروح کر سکتا ہوں اور نہ دیکھ سکتا ہوں۔ ورنہ موصوفہ کے اشعار کی خصوصیات نمایاں کر کے ثابت کرتا کہ ان کا درجہ شعر و ادب میں کس قدر بلند ہے؟

مخلص جگر مرادآبادی

کلامِ اختؔر کی روانی وسادگی

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنے کے ہیں۔اس لیے تمام اصناف سخن کے مقابلہ میں غزل زیادہ لطیف اور نرم و نازک جذبات کی حامل ہوتی ہے لیکن اس غزل کی بے پناہی اور قیامت آفرینی کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟ جو خود صنف نازک کے جذبات ومحسوسات کی ترجمان ہو......

علامہ شبلی نعمانی نے عورت کو چہرۂ کائنات کا غازہ اور آب ورنگ کہا ہے، تو اسی آب ورنگ کائنات کی طرف سے جب یہ کہا جائے کہ

رُودادِ غم بیان تو کیا کر رہی ہوں میں؟
اک فرض ناگوار ادا کر رہی ہوں میں!

تو اس اثر انگیزی کی بھلا کوئی حد بندی ہوسکتی ہے؟

محترمہ خطیبۂ ہند، زہرۂ سخن سیدہ سردار بیگم اختؔر کو کون نہیں جانتا۔تمام ہندوستان میں اخباروں اور رسالوں کے اوراق سے لے کر جلسوں اور کانفرنسوں کے پلیٹ فارموں تک ان کی خطابت وسخن سنجی کی دُھوم مچی ہوئی ہے۔وہ بیک وقت آتش بیان مقررہ بھی ہیں، ڈسپلن قائم رکھنے والی کمانڈر بھی، شیریں مقال شاعرہ بھی۔شعلہ وشبنم کی یکجائی۔پھولوں اور انگاروں کا اجتماع۔

خصوصیات کلام، اختر صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ترنم، روانی اور سادگی ہے۔ وہ شعر کو فیشِ غورث کا نظریہ نہیں بناتیں، سیدھی سادی بات کہتی ہیں، جو انداز بیان کی پاکیزگی اور دلکشی کے بعد سحر حلال بن جاتی ہے۔

اختر کی غزل میں جدید تغزل کے قریب قریب تمام رجحانات پائے جاتے ہیں۔ الفاظ کو اپنے محل اور موقع سے برتنے کا بھی اُن کو سلیقہ ہے۔ مفہوم ادا کرنے پر اُن کو پوری قدرت حاصل ہے۔ اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس دَور کے بے راہرو شاعروں کی طرح نامانوس، مغلق، خود تراشیدہ ترکیبوں سے اُن کی غزلیں پاک ہوتی ہیں۔

ماہرؔ القادری

زمانۂ حال کی بہترین شاعرہ

خطیبۂ ہند، زہرۂ فن سیدہ اختر میری قومی بہن ہیں اور ملک وقوم کی یادگار محسنہ اور خادمہ۔

بھائی اگر بہن کی جائز تعریف بھی کرے تو دنیا اسے جانب داری سمجھے گی، اس لیے ایک بھائی اپنی بہن کی عظمت کے لیے صرف اتنا کہنا چاہتا ہے:

آفتاب آمد دلیل آفتاب

''اختر واقبال'' آپ کے زیر نظر ہے۔ جوش ملیح آبادی کا ساغر، جگر مرادآبادی کا پیمانہ اور ماہر القادری حیدرآبادی کا جرعۂ رنگیں پئیں اور پینے کے بعد ایمان داری سے دور کے اس فیصلہ کی تائید فرمائیں کہ سیدہ اختر زمانۂ حاضر کی بہترین شاعرہ، ادیبہ اور مقررہ ہیں۔

دور ہاشمی

زہرۂ سخن

آل انڈیا اردو کانفرنس و مشاعرہ منعقدہ شہر بنگلور کے موقع پر بتاریخ ۲۹ نومبر ۱۹۳۴ء علامہ سیماب فرماتے ہیں:

خواتین و حضرات!

اس سے پہلے کہ مشاعرہ شروع ہو، میں ایک مجلسی فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آج دن کو جو لوگ اُردو کانفرنس کے جلسے میں موجود تھے، انھیں معلوم ہے کہ اُردو کانفرنس نے کیسے کیسے ماحول کو جگمگا دینے والے اور جنوبی ہند میں آفتاب اُردو کی عالم افروز شعاعیں پھیلانے والے ریزولوشن (Resolution) پاس کیے ہیں، جو تمام جنوبی ہند کے لیے عموماً اور بنگلور کے لیے خصوصاً نئی بیداریوں اور نئے اُجالوں کے ضامن ہیں۔

یہ سب کچھ خطیبۂ ہند سیدہ اختر صاحبہ کی مساعیٔ جمیلہ اور لطیف الخیالی کا نتیجہ ہے اور جس میں اُن کے ایثار مجسم شوہر خان بہادر عبدالغنی مالک فرم شمس الدین اینڈ سنز رئیس اعظم نصیر آباد نے تقریباً اٹھارہ ہزار روپے صرف کر کے اُردو نوازی کا ثبوت دے کر ہندوستان پر احسان کیا۔

اگر میں ریاست میسور کا فرماں روا ہوتا تو آج اختر صاحبہ کو اپنی حکومت کی طرف

سے کوئی سرکاری خطاب دے کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتا۔

لہذا میں ایک خادم ادب اور شاعر ہونے کی حیثیت سے تمام اراکین و شرکاء کانفرنس کی خوشی سے اس بھری محفل میں سیدہ اختر صاحبہ کو "زہرۂ سخن" کا تابناک خطاب دیتا ہوں جس کی وہ حقیقی معنوں میں مستحق ہیں۔

اُمید ہے کہ خطیبۂ ہند اس ہدیۂ درخشاں کو دنیائے ادب کی جانب سے قبول فرمائیں گی۔

سیمابؔ اکبرآبادی

پیش لفظ

یہ اوراق سیدہ اختر کے اُن افکار کے حامل ہیں کہ اگر ان کی معنویت کو سامنے رکھ کر کوئی شخص ان پر کار بند ہو تو وہ خود بھی سیدہ اختر کی طرح اپنے سینہ کو جوش اسلام سے معمور پا سکتا ہے۔

اقبالؔ کا کلام اور خطیبۂ ہند کی تضمینیں! سونے پر سہاگہ، شاید ایسے ہی موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔

نیاز فتحپوری

۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء

مناجات

چمن کا دیوانہ حادثاتِ خزاں کے صدمات سہ رہا تھا
وہی دل از بس ملول تھا جو نشاط کا جلوہ گہ رہا تھا
عرق جبیں پر تھا اور آنکھوں سے اس کی خونابہ بہ رہا تھا
کل ایک شوریدہ خوابگاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا

کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ خوش کلامی، یہ خوش نگاہی مگر ہیں مکر و فریب سارے
کریں گے کیا رہبری کسی کی جو آپ ہیں گمرہی کے مارے
یہ ناخدا ہیں خدائے باطل، لگائیں گے ناؤ کیا کنارے
یہ زائرانِ حریم مغرب، ہزار رہبر بنیں ہمارے

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا! جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

جو راہبر خود ہوں مست و بیخود قدم نہ کیوں اپنا ڈگمگائے
جو رہنما آپ ہی غلط ہوں تو کون پائے طلب بڑھائے
میں پوچھتی ہوں کہ ان کو آخر کہاں تلک کوئی آزمائے
غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے

بگاڑ کر تیرے مسلموں کو بنائے ملت مٹا رہے ہیں

فضا ہی کچھ اور ہو گئی ہے، ہوا ہی کچھ اور چل گئی ہے
خراب تر ہے، مگر سمجھتے ہیں دل کی حالت سنبھل گئی ہے
زباں سے اقبالؔ آپ کے کیوں یہ بات آخر نکل گئی ہے
سنے گا اقبالؔ کون اِن کو کہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانہ میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

☆☆☆

آہ، دِلّی!

داستانِ عظمتِ اسلام یاں خوابیدہ ہے
شوکتِ سلطانیِ مغلیّہ آرامیدہ ہے
خاک اس کی وجہ تسکینِ دلِ رنجیدہ ہے
سر زمینِ دلّی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرّہ ذرّہ میں لہو اَسلاف کا پوشیدہ ہے

ہو نہیں سکتی غرض اس سے کوئی بہتر زمیں
ایسی جاں پرور زمیں ایسی بہار آور زمیں
چرخ کو رشک آئے، ایسی روکش خاور زمیں
پاک اس اُجڑے گلستاں کی نہو کیوں کر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سر زمیں

اس گلستاں میں کھلے کیا کیا نہ گلہائے بہار
سرمدؔ و داراؔ و عالمگیرؔ جیسے ذی وقار
اس زمیں پر کیوں نہ اخترؔ جان و دل کر دوں نثار
سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار.
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

رہرو منزل نہیں بھولا ابھی منزل کی یاد
موجِ آوارہ کو یعنی اب بھی ہے ساحل کی یاد
بھول جاؤں کیسے اختر جلوۂ کامل کی یاد
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

☆☆☆

نازونیاز

لٹا کے سرمایۂ خودی کو زمانے میں سرفراز ہو جا
قتیلِ تیغِ نگاہ بن جا شہیدِ حُسنِ مجاز ہو جا
اُٹھ اے حریصِ غمِ محبت، ہمہ غمِ جاں گداز ہو جا
سُن اے طلبگارِ دردِ پہلو، میں ناز ہوں تُو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا

زوال تجھ کو ہوا ہے اختر خود اپنے احساسِ کمتری سے
وگرنہ تاریخِ رفتہ تیری بھری ہے اقدامِ برتری سے
اُلٹ بھی دے اپنی آستیں کو، تُو کام لے اَب قلندری سے
نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال، شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینہ میں تُو بھی آئینہ ساز ہو جا

ترے ہی اعمالِ سیئہ کا نتیجہ ہے یہ زوال تیرا
نہ تھا کبھی ایسا خوار پہلے، نہ تھا زبوں ایسا حال تیرا
اگر تُو چاہے تو لوٹ سکتا ہے اب بھی جاہ و جلال تیرا
غرض کہ پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تُو ادا مثالِ نماز ہو جا

اگر تُو آمادۂ جنوں ہے تو چیز کچھ بھی نہیں اُسیری
خزانے سارے جہاں کی جھولی میں بھر لے اپنی تری فقیری
گدائے میخانۂ عمل بن تو دیکھ پھر اپنی تُو امیری
نہ ہو قناعت شعار گل چیں اسی سے قائم ہے شان تیری

وُفورِ گُل ہے اگر چمن میں تُو اور دامن دراز ہو جا

نہ راستی کی طلب ہے ان کو نہ راہِ حقانیت کے جویا
ہمیں یہ کیا دیں گے خود انھوں نے ہی دولتِ دیں سے ہاتھ دھویا
وہی یہ کاٹیں گے آخرت میں، انھوں نے جو اس جہاں میں بویا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبالؔ، آذری کر رہے ہیں گویا

بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

☆☆☆

تمنائے انجم

غیر ممکن ہے بلندی نظر کو چھوڑوں
یہ نہ ہو گا کبھی گلہائے شرر کو چھوڑوں
یا کبھی شاہدِ مقصود کے در کو چھوڑوں
لطف ہمسائگیِ شمس و قمر کو چھوڑوں
اور میں خدمتِ پیغام سفر کو چھوڑوں

گوشۂ زہد سے پیمانہ پرستی اچھی
ہوشِ ناکارہ سے ہے رند و مستی اچھی
بزم انجم سے مری محفلِ ہستی اچھی
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی
اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی

کون سمجھے گا جو مقصودِ سخن ہے میرا
کس کو سمجھاؤں کہ کیا رنج و محن ہے میرا
کیا کہوں کس کو بتاؤں جو چلن ہے میرا
آسماں کیا؟ عدم آباد وطن ہے میرا
صبح کا دامنِ صد چاک کفن ہے میرا

جانتی ہوں کہ نہیں میں کوئی داتا بیٹا
یہ مگر سچ ہے مرا ذوق نہیں پارینہ
بلکہ صد مشرقِ انوار ہے میرا سینہ
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقیِ موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا

یہ تمنا ہے کوئی خاک کا پیکر بنتا
بزمِ خاکی میں کہیں شمعِ منور بنتا
کچھ نہ بنتا تو میں اختر سا سخنور بنتا
میری قسمت میں جو ہوتا تو نہ اختر بنتا
قعرِ دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

☆☆☆

اختر و اقبالؔ

یہ مانا یوں تو ہے ساری زمیں سارا جہاں اپنا
قمر اپنا فلک اپنا مکان و لامکاں اپنا
مگر کیا لطف ہے جب ہو نا کوئی ہم زباں اپنا
کہاں اقبالؔ تُو نے آ بنایا آشیاں اپنا

نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامان رُسوائی

یقیں ہے دولتِ نایاب کو کھوتا تو ہے لیکن
یہ مانا یاد ماضی میں بہت روتا تو ہے لیکن
اثر تیری نوائے تیز کا ہوتا تو ہے لیکن
شرارے وادی ایمن کے تُو بوتا تو ہے لیکن

نہیں ممکن کہ پھُوٹے اس نوا سے تخم سینائی

نہ غنچوں کا ترنم ہے نہ آمد ابر باراں کی
خزاں نے چھین لی ہیں رونقیں ہر سنبل ستاں کی
کہ پہچانی نہیں جاتی ہے اب صورت خیاباں کی
قیامت ہے کہ فطرت سو گئی اہل گلستاں کی

نہ ہے بیدار دل پیری نہ ہمت خواہ برنائی

شرابِ سرخ جب باقی نہیں ہے آبگینوں میں
تو پھر مستی کہاں پیر مغاں کے ہم نشینوں میں
نہ کعبہ ہے نہ بت خانہ نہ سجدے ہیں جبینوں میں
دلِ آگاہ جب خوابیدہ ہو جاتے ہیں سینوں میں
نوا گر کے لیے زہر آب ہوتی ہے شکر خائی

اُٹھ اخترؔ کر سفر کا عزم تُو اب خیاباں سے
اگر جوشِ جنوں ہے کام لے کوہ و بیاباں سے
ملا دے چاکِ دل کو چاکِ دامان و گریباں سے
نہیں ضبطِ نوا ممکن تو اُڑ جا اس گلستاں سے
کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی

☆☆☆

بارگاہِ شہود

خبر نہیں تیرے آہن پہ چڑھ گیا کیوں زنگ
نہ دل میں تیرے بصیرت نہ چہرے پر کچھ رنگ
بہ ہوش باش کہ تجھ سے زمانہ ہے دل تنگ
ترا وجود سراپا تجلّیِ اُفرنگ
کہ تُو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

ترے خرام میں مستی نہ کہ بھی متوالی
ترے لباس سے ظاہر ہے تیری خوشحالی
مگر نہیں تجھے احساسِ بے پر و بالی
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار، بے شمشیر

کسی کی جلوہ کدہ ہے یہ بارگاہِ شہود
ہر ایک ذرّہ ہزاروں تجلیوں کی نمود
نظر اٹھا کہ ہر اک سُو ہے حسن لا محدود
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

تجھے سمجھنے کی توفیق دے ترا معبود
نہیں ہے صرف زمیں تک یہ زندگی محدود
مگر ابھی نہیں تُو آشنائے رازِ وجود
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر، کہ جوہر ہے بے نمود ترا

☆☆☆

نورِ مطلق

مژدہ بادا کہ کنوں دیدہ ورے پیدا شد
نورِ خورشید بہ شکلِ شررے پیدا شد
محرمِ صدق و صفائے دگرے پیدا شد
نورِ مطلق بہ لباسِ بشرے پیدا شد
نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

گوشہ گوشہ سے نمایاں ہے تجلّی کا ظہور،
ذرّے ذرّے میں نظر آتے ہیں انوارِ شعور
غنچے غنچے کی زباں پر ہے بصد کیف و سرور
"چشمِ ما روشن و دل شاد" ادھر آئیں حضور
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

کہتے تھے اہلِ فلک ہم ہیں فقط جانِ ازل
ہیں ہمیں واقفِ اسرارِ دبستانِ ازل
جانتے تھے نہ مگر کچھ بھی یہ دربانِ ازل
ہاتھ میں کس کے ہے سر رشتۂ پیمانِ ازل

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں، پردہ درے پیدا شد

پیدا ہوتی ہی چلی جاتی تھی ہر بات میں بات
آخرش سن ہی لیا دہر نے پیغام حیات
الغرض کھل کے رہا، چھپ نہ سکا رازِ نجات
یعنی انسان کی اس ہستیٔ فانی کا ثبات

آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

اے خوشا با دلِ صد چاک تپیدن ہمہ عمر
اے خوشا صورتِ خاشاک تپیدن ہمہ عمر
کیونکہ ہے حاصلِ ادراک تپیدن ہمہ عمر
معنیٔ آیۂ لولاک تپیدن ہمہ عمر

زندگی گفت کہ در خاک تپیدن ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

☆☆☆

مجذوبات شیخ

کہتے ہیں کچھ یہ عہد فقط زیر و بم کا ہے
کچھ کہہ رہے ہیں دور فروغ ستم کا ہے
ہے بعض کا خیال، وفورِ اَلم کا ہے
فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے

دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کار گر

ہر چند یہ حکایتِ رنگیں ہے دلنشیں
رنگینیوں میں اس کے نہیں ہے کمی کہیں
اور اس کو سن کے نیند بھی آتی ہے بالیقیں
لیکن جناب شیخ کو معلوم یہ نہیں

مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سُود و بے اثر

جھوٹی نمود، عارضی دولت بہت یہاں
لیکن نہیں صحیح ترقی کا یہ نشاں
در اصل ہے وہ حوصلہ و عزمِ جانفشاں
تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں اب کہاں

ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

اوہام باطلہ سے جھجکتا ہو جس کا دل
اندیشۂ غلط سے دھڑکتا ہو جس کا دل
آغوش بے حسی میں سسکتا ہو جس کا دل
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل

کہتا ہے کون اس سے مسلماں کی موت مر

یہ بے حسی کی زندگی ہے کوئی زندگی
دل غم سے ہے نڈھال مگر لب پہ ہے ہنسی
سچ سچ کہوں بُرا نہ اگر مانیں شیخ جی
تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی

دنیا میں جس کو پنجۂ خونیں سے ہو خطر

مشرق اُٹھا نہ حق کی حمایت کے واسطے
قربانی کی کسی نے نہ ملت کے واسطے
کچھ بھی کیا نہ قوم کی عزت کے واسطے
باطل کی قال و فر کی حفاظت کے واسطے

یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

گو اس کو کوئی ربط نہیں اب حجاز سے
گو اس کو واسطہ ہے بہت کم نماز سے

گو اس کا سینہ خالی ہے سوز و گداز سے
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے

مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

مانا کہ ذات آپ کی ہے فخر کائنات
مانا فقط ہے زہد و ورع آپ کی حیات
لیکن یہ پوچھتی ہوں، اگر ہو کچھ اِلتفات
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات

اسلام سے محاسبہ، یورپ سے درگذر!

☆☆☆

حرم و دیر

خدا رکھے جمالِ عارضِ جاناں کی زیبائی
تجلی کون سی تھی جو میرے دل میں نہیں آئی
وہ تیری لطف پاشی اور وہ تیری پذیرائی
مجھے مل ہی گیا تجھ سے میرا حق جبیں سائی

نہ تو اندر حرم گنجی، نہ در بت خانہ می آئی
و لیکن سوے مشتاقاں، چہ مشتاقانہ می آئی

یہ مانا ہے ترا مشتاق سارا عالمِ امکاں
تمنا ہے ترے جلوے کی ہر ہر ذرہ میں پنہاں
مگر ہر سینے میں تو جاگزیں ہو، یہ نہیں شایاں
تری منزل میرا دل ہے اِدھر آ اے شہِ خوباں

قدم بیباک تر نہ در حریم جان مشتاقاں
تو صاحب خانہ، آخر چرا دزدانہ می آئی

محبت کی کرے گا تُو کہاں تک آبرو خیزی
قیامت ہے تری فطرت کی یہ نیرنگی و تیزی
کبھی انداز دارائی، کبھی انداز تبریزی
کبھی انداز جمشیدی، کبھی انداز چنگیزی

گہے صد لشکر انگیزی کہ خون دوستاں ریزی
گہے در انجمن با شیشہ و پیمانہ می آئی

مٹانے کے لیے دنیا سے رسم فتنہ انگیزی
بلا کی تجھ میں پائی جاتی ہے بیباکی و تیزی
ترا جادہ صداقت ہے جدا از رسم چنگیزی
خدا کا شکر ہے مٹ کر رہی تیری کم آمیزی

تو بر نخلِ کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر "شمعِ یتیمے" صورتِ پروانہ می آئی

تامل ترک کن تیرے بروں آر از سر ترکش
کمر بند و ستیزہ کار شو با دشمنِ سرکش
بگو اختر چرا خواہی نہ از خود آگہی درکش
بیا اقبالؔ و آہِ شعلہ پاش از سینہ ات برکش

بیا اقبالؔ جامے از خمستانِ خودی درکش[1]
تو از میخانۂ مغرب، ز خود بیگانہ می آئی

[1] درک بہ معنی فہم و فراست

گدازِ دل

جس میں نہ ہو گداز تُو وہ دل نہ کر قبول
طوفاں سے کھیل دعوتِ ساحل نہ کر قبول
بے حاصلی میں لطف ہے حاصل نہ کر قبول
تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اُٹھ اور بڑھ کے قوتِ باطل سے کر ستیز
برق و شرر کی طرح دکھا اپنی جست و خیز
یہ غفلتیں، یہ بے حسی ہنگامِ رست و خیز!
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

گرمی کا نام تک نہیں تیری حیات میں
ہے روشنی نہ دن میں ترے اور نہ رات میں
جب دیکھو دل پڑا ہے ترا سومنات میں
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول

دی بارہا صدا تجھے کوس رحیل نے
بیدار لاکھ بار کیا ہر دلیل نے
کچھ بھی نہ جب سنا مری طبع علیل نے
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

وہ دن بھی تھا کہ ہاتھ میں تھے تیرے روم و رے
پر اب نہیں ہے جز کف افسوس کوئی شے
آخر یہ سجدۂ در بت خانہ تا بہ کے
باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

☆☆☆

نغمۂ داؤد

یہ کس نے آج سجائی ہے بارگاہِ وجود
ہے ایک ربط نمایاں میانِ غیب و شہود
وفورِ گل ہے چمن میں کہ آتش بے دُود
بہار تا بہ گلستاں کشیدۂ بزم سرود
نوائے بلبلِ شوریدہ چشمِ غنچہ کشود

ہر ایک ذرہ کے پیکر میں حشر ہے برپا
زمیں سے تا بفلک اضطراب ہے برپا
مگر نہیں ہے ابھی رازِ زندگی افشا
گماں مبر کہ سرشتند در ازل گل ما
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیر وجود

چمن میں آ گیا جب کوئی رند جام بدست
کلی کی آنکھ کھلی بلبلیں ہوئیں بد مست
یہی ہے کار گہہ زندگی بادہ پرست
بہ علم غزہ مشو، کارِ میکدہ اگر ست
فقیہ شہر، گریبان و آستاں آلود

پڑے ہوئے تھے زمانہ پہ عقل کے پردے
خدا کا شکر کہ آخر حجاب راز اُٹھے
پلا کے بادہ حقیقت کے بھید کھول دیے
شبے بہ میکدہ خوش گفت پیر زندہ دلے

بہ ہر زمانہ خلیل ست و آتش نمرود

ہر ایک گل نظر آتا ہے جام بادہ بدست
اُٹھائی جس نے نظر ہو گیا وہی بد مست
یہ جلوہ گاہِ چمن ہے کہ جلوہ گاہِ الست
بہار برگِ پراگندہ را بہم بر بست

نگاہِ ما ست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود

حریم عشق میں لازم ہے آدمی کو شعور
نگہ کی جنبش بیجا بھی یاں ہے سخت قصور
بڑے بڑے نظر آتے ہیں عشق میں مجبور
بہ دیریان سخن نرم گو کہ عشق غیور

بنائے بت کدہ افگند در دل محمود

ضمیر قوم ابھی تک ہے آہ، غیر پرست
گدازِ قلب بھی مفقود، ذوق عشق بھی پست

مگر سے گا تری کون اختر بد مست
بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤد

☆☆☆

نغمہ ہائے الست

یہ آج چھیڑ دیے کس نے نغمہ ہائے الست
کہ شاخسار میں ہے غنچہ غنچہ خرم و مست
یہ کون باغ میں آیا ہے رند بادہ پرست
بیا کہ ساقیِ گل چہرہ دست بر چنگ است

چمن ز بادِ بہاراں جوابِ ارژنگ است

میں کیا کہوں کہ ہے سیلِ بہار میں کیا مد
نہیں ہے باغ میں اب گل سے خار کو کوئی کد
نہیں ہے آج نشاط و سرور کی کوئی حد
حنا ز خونِ دلِ نو بہار می بندد

عروسِ لالہ چہ اندازِ تشنۂ رنگ است

صدائے دل سے مرے سیکھ برق تاثیری
رہے گی تا بہ کجا یہ غلامی و پیری
عمل ہے اصل، نہیں کوئی امرِ تقدیری
بچشمِ عشق نگر تا سراغ او گیری

جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

چو سرو بینمت از قد تو نمو گیرد
گل بہار ز پیراہن تو بو گیرد
دُر از تبسم تو رنگ آبرو گیرد
تو قدرِ خویش نہ دانی بہا ز تو گیرد

وگرنہ لعل درخشندہ پارۂ سنگ است

سنو ترانۂ اختر کو گوشِ دل سے سنو
اُٹھو اُٹھو ارے او اہل کارواں اُٹھو
بڑھائے جاؤ قدم وہاں نہ اب کہیں ٹھہرو
بلند تر ز سپہر ست منزل من و تو

براہِ قافلہ خورشید میل فرسنگ است

☆☆☆

زخمِ کرم

تجھ سے زیادہ رمز داں کون ہے یاں سخن سرا
شاعرِ نغمہ آفریں ہاں، اسی لے میں گائے جا
جو تجھے کہنا تھا کہا تُو نے ہمیشہ برملا
اشہد ان لا الٰہ، اشہد ان لا الٰہ

باز بہ سرمہ تاب دہ، چشمِ کرشمہ زائے را
ذوقِ جنوں دو چند کن، شوقِ غزل سرائے را

خالقِ دو جہاں مری سن لے دعائے بیقرار
حیف کہ نقش ہوں ترا اور ہوں رہنِ انتشار
خاک رہوں گی تابہ کے اے مرے پاک کردگار
تنگ ہے میرے واسطے اب یہ حیاتِ مستعار

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار
لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

ہیچ ندانم آخرا راحتِ آشیانہ چیست
در قفسم و بے خبر رشتہ بہ پائے من زکیست

نالہ کشم نہ برملا، آہ و فغانِ من خفی ست
با کہ بگویم آخرا ایں ہمہ داستانِ زیست
قصۂ دل نہ گفتنی ست دردِ جگر نہفتنی ست
خلوتیاں، کجا برم لذت ہائے ہائے را
اُس کو پکارتی ہوں میں دشت و چمن میں چار سُو
ڈھونڈھتی ہوں اُسی کو میں لحظہ بہ لحظہ کو بہ کو
حال جو عندلیب کا ہے وہی میرا ہو بہ ہو
نالۂ گرم سر کروں ہے یہی ایک آرزو
آہ دُرو نہ تاب کو اشک جگر گداز کو
شیشہ بہ سنگ می زنم، عقل گرہ کشائے را
دل میں اُسی کی یاد ہے دل میں اُسی کی ہے لگن
بندۂ لطف ہوں، نہیں مجھ کو شکایتِ محن
کیا کہوں کون سی اُمنگ آج ہے دل میں موجزن
چاہتی ہوں یہی کہ ہو رشکِ اِرم مرا وطن
بزم بہ باغ وراغ کش، زخمہ بہ تارِ چنگ زن
بادہ بجور، غزل سرائے، بند کشا قبائے را

جتنے ہیں اہل کارواں خواب میں ہیں ہنوز مست
گونج رہا ہے ہر طرف شور و فغان بود و ہست
صبح ہوئی، اُٹھیں اُٹھیں سر کو جھکائیں حق پرست
کوچ کا وقت آ گیا کچھ کریں اپنا بندوبست

صبح دمید و کارواں کرد نماز و رخت بست
تو نہ شنیدۂ مگر زمزمہ درائے را

اختر خوش رقم ہوں میں، شعر مرا ہے جام جم
فکر مری ہے نو بہ نو، تازہ بہ تازہ دم بہ دم
بندۂ حجاز کی ہوں میں، میں نہیں بندۂ عجم
ہو نہ سکا کسی جگہ میرا سر نیاز خم

نازِ شہاں نمی کشم زخم کرم نمی خورم
در نگر اے ہوس فریب، ہمت ایں گدائے را

☆☆☆

مرگِ خودی

خودی کی موت سے اَخلاق کا ہے شیشہ چُور
خودی کی موت سے انسان ہو گیا مجبور
خودی کی موت سے حیوانیت کا گویا ظہور
خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

خودی کی موت سے طاری ہیں ہم پہ سنگیں خواب
خودی کی موت سے ہے گوہرِ وفا بے آب
خودی کی موت سے ذوقِ طلب ہے اب نایاب
خودی کی موت سے رُوحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عِظام

خودی کی موت کا قبضہ ہے نونہالوں پہ
خودی کی موت ہے چھائی ہوئی خیالوں پہ
خودی کی موت کا سایہ ہے خستہ حالوں پہ
خودی کی موت ہے ہندی شکستہ بالوں پہ
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

خودی کی موت سے دن بھی ہوا شب دیجور
خودی کی موت سے انسان کھو چکا ہے شعور
خودی کی موت سے انسان ہو گیا مقہور
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور

کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

☆☆☆

شکر و قند

یوں تو نظر آتے ہیں پرستارِ خدا بھی
اور مدعیانِ سرِ تسلیم و رضا بھی
کر لیتے ہیں ہاں نعرۂ حیدر جہلا بھی
شاعر بھی ہیں پیدا، علما و حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

راہیں ہیں جدا سب کی مگر عزمِ سفر ایک
رفتار میں ہے فرق مگر راہ گذر ایک
یعنی کہ نظر ایک ہے اور حدِّ نظر ایک
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

ہیں یوں تو بظاہر وہ بہت خرم و خوشرو
لیکن نہیں ان میں ہے شرافت کی کوئی خُو
پھر کیوں نہ کریں آپ ہی اس جھگڑے کو یکسو
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

آزادیٔ انسان کے سب کر دیے در بند
جھوٹے ہیں جو یہ کھاتے ہیں اللہ کی سوگند
دیتے ہیں ہمیں زہر بہ شکلِ شکر و قند
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

☆☆☆

مناصبِ حیات

اب اس کے ساز میں باقی نہیں کوئی آہنگ
دکھائی دیتا ہے الماس اس کو پارۂ سنگ
سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے اس کی عقل ہے دنگ
ہوا ہے بندۂ مومن فسونیِ افرنگ
اسی لیے تو قلندر کی آنکھ ہے نمناک

سنے گا کون، کہوں کس سے میں فسانۂ شب
ہیں اہلِ بزم یہاں محوِ خواب سب کے سب
مجھے تو شرم سی آتی ہے کھولوں کیا میں لب
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب
کہ ان کے واسطے تُو نے کیا خودی کو ہلاک

ہیں ایک تیری نگہ میں بلندی و پستی
تُو کیا سنے گا ترے سر میں چھائی ہے مستی
سمجھ سکے گا نہ تُو کیا ہے غایتِ ہستی
مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی
سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعتِ چالاک

ہم اپنا کیسۂ اُمید بھر نہیں سکتے
جو ذرّے بیٹھ گئے وہ اُبھر نہیں سکتے
کچھ ایسے بگڑے ہم، اب سنور نہیں سکتے
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط اُن کا جوہرِ اِدراک

☆☆☆

سحر

یہ سحر جس کا ہر اک لمحہ ہے رشکِ نوروز
یہ سحر جس کی تجلی ہے بصارت افروز
یہ سحر جس کی ضیائیں ہیں بصیرت آموز
یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے اِمروز

نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس نے کیا ختم زمانے کا جمود
وہ سحر جس کی تجلی ہے دو عالم کی نمود
وہ سحر ختم ہوئی جس سے شبِ زنگ آلود
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود

ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

☆☆☆

صبح کا تارا

اُسی نگہ کو میسر ہے حق کا نظارا
اُسی سے نورِ تجلّی کا چڑھتا ہے پارا
وہی ہے ذرّہ حقیقت میں انجمن آرا
وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

تُو ایک ذرّہ ہے پر آفتاب سے بڑھ کر
ہے تیرا چہرہ رُخِ ماہتاب سے بڑھ کر
ہے سازِ دل ترا چنگ و رُباب سے بڑھ کر
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

عجب نہیں وہ اگر ہے صداقت امروز
عجب نہیں جو نگہ مثلِ تیر ہے دل دوز
عجب نہیں ہے اگر وہ صدائے حق آموز
عجب نہیں ہے اگر ساز اس کا ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لیے بس ہے ایک چنگاری

اُسی کی ذات سے قائم ہے جوشِ ایمانی
اُسی سے پاتی ہے تسکین روحِ ایمانی
اُسی نے کی ہے عطا خس کو شعلہ سامانی
خدا نے اُس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی

کہ اُس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری

نہ دیکھ اُس کی مگر ظاہری تباہی کو
اُسے تو فرق پہ رکھنا ہے تاجِ شاہی کو
اُسے مٹانا ہے اب کفر کی سیاہی کو
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اُس کی بے کلاہی کو

یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

☆☆☆

حکومت

دیں کو اپنے نہ کبھی اُٹھ کے سنوارا لیکن
دل سے اُٹھا نہ کبھی اُن کے شرارا لیکن
نہ دیا قوم کو اک دن بھی سہارا لیکن
ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و ملّا کو بُری لگتی ہے درویش کی بات

آپ کے وعظ و نصیحت سے مجال انکار؟
کرنے دیجئے مجھے اس درد کا لیکن اظہار
قوم کے حال پہ اب لطف نہ کیجئے زنہار
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات

یہ جہاں کیا ہے حباب، آہ مجھے یہ تسلیم
خاک میں مل گئی شاہوں کے ہزاروں دیہیم
نہ رفیق اُن کا رہا یاں نہ رہا کوئی ندیم
گرچہ اس دَیرِ کہن کا ہے یہ دستور قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات

ہر نفس صورتِ زورق ہے اسی ملت کا
شہرہ اس دہر میں بر حق ہے اسی ملت کا
مستیِ شوق سے دل شق ہے اسی ملت کا
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات

☆☆☆

علم و دین

نہ پوچھ مدرسہ و خانقاہ کی تعلیم
نہ روشنی نہ بصیرت نہ جذبۂ تکریم
عجب زمانہ ہے کرتا نہیں اسے تسلیم
وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

تمام عالمِ ہستی بے ثبات بھی ایک
صفات و ذات بھی ایک اور ممکنات بھی ایک
ہے غزنوی بھی یہاں ایک، سومنات بھی ایک
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

تڑپ نہیں ہے تو دل میں نہیں ہے پھر کچھ بھی
اسی کا نام ہے دنیا میں عالمِ پستی
جہاں میں یوں نہیں اُبھری ہے کوئی قوم کبھی
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم

کہاں کا نالۂ بلبل اگر بہار نہیں
وہ گل ہے کون جو، ہم نشین خار نہیں
تری نگاہ مگر اس کی راز دار نہیں
وہ علم کم بصری جس سے ہم کنار نہیں

تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ کلیم

☆☆☆

پیرِ حرم سے

دیکھو جسے لیلائے فرنگی کا ہے مجنوں
چھایا ہے دل و رُوح پہ تہذیب کا افسوں
ہر سر میں ہے سودائے خیالات کا افسوں
مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا

ہر آنکھ ہے بے نور، ہر اک قلب زبس تار
محفل میں جسے دیکھیے مستِ مئے پندار
ہر بات پہ بحثیں ہیں ہر ایک نکتہ پہ تکرار
ہر سینہ میں ایک صبحِ قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا

ہے جام میں اپنے کہاں اب بادۂ صافی
کشکول گدائی ہے ہمارے لیے کافی
بیمار ہو ایسا تو خدا بھی نہیں شافی
کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا

تعمیر ہوئے مدرسے فردوسِ بریں کے
تعلیم ہی ناقص ہو تو کیسے کوئی جاگے
اس خاک سے کس طرح ستارہ کوئی چمکے
ممکن نہیں تعمیرِ خودی خاتھوں سے
اس شعلۂ نمناک سے ٹوٹے گا شرر کیا

☆☆☆

اشارۂ فطرت

یہ ہر ایک لحظۂ فطرت تجھے کرتی ہے اشارہ
یہ تری زندگی ہے شعلہ، تُو بنا ہے کیوں شرارہ
یہ ترا وجود محزوں، یہ لباس پارہ پارہ
دلِ مردہ دل نہیں اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

میں بتاؤں کیا کہ حالت تری کس قدر زبوں ہے
نہ سرشک آنکھ میں ہے نہ رگوں میں جوشِ خوں ہے
ہے لباس تیرا ثابت، یہ جنوں کوئی جنوں ہے
ترا بحر پُر سکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیِ کنارہ

ہے جمود تجھ پہ طاری، تجھے کچھ پتا نہیں ہے
کوئی مدعا نہیں ہے کوئی ولولہ نہیں ہے
نہ ہو اضطراب دل میں تو اسے بقا نہیں ہے
تو ضمیر آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بیقرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ

مرے شعر کو سنا ہے گُل و انجم و قمر نے
دُر و لعل مجھ کو بخشے ہیں خدائے بحر و بر نے
ہیں جگائے لاکھ جادو مری جنبشِ نظر نے
ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے

مری خاک بے شرر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

یہ نوائے دلکشا ہے، نہیں یہ صدا بہ صحرا
کوئی کیسے دیکھے اختر میری فکرِ نو کا جلوا
مگر اس جہاں میں شاید نہیں کوئی چشم بینا
نظر آئے گا اُسی کو یہ جہانِ دوش و فردا

جسے آ گئی میسر مری شوخیٔ نظارہ

☆☆☆

کارگہِ شیشہ گراں

شمع پر جل بجھا پروانہ، پر اُٹھا نہ دھواں
ایسا ناکام نہیں میرا مگر سوزِ نہاں
اللہ اللہ، یہ تقدیر، یہ منظر، یہ سماں
حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گل بدناں، سیم براں

تکمۂ لعل ہے یا شاخوں پہ غنچے کی نمود
صوتِ بلبل ہے ہر اک کنج میں یا بزمِ سرود
آگ سی چار طرف پھیلی ہے لیکن بے دُود
در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت کشود
از کجا آمدہ اند، ایں ہمہ خونیں جگراں

ہے بجا گر ہے تجھے آرزو رفعت و فوق
واقعی تنگ ہے گردن میں غلامی کا یہ طوق
پورا یوں ہو نہیں سکتا ہے مگر تیرا شوق
اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق
نخورد بادہ کس از کارگہِ شیشہ گراں

سینہ ویران تھا، دل سرد تھا، مفقود اُمنگ
عرصۂ زندگی ہوش تھا میرے لیے تنگ
لیکن اس طرح ہٹا راہ سے میری یہ سنگ
خرد افزود مرا درسِ حکیمانہ فرنگ

سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

آہ از سینہ بروں آر کہ تابِ دلِ تست
گامزن جانب یثرب کہ ہماں منزلِ تست
گرزنی نعرۂ اسلام جہاں حاصلِ تست
برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست

اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

کھاتے ہیں میرے تقدس کی ملائک بھی قسم
فخر ہے میرے لیے بندگیِ شاہِ اُمم
مجھ سے قائم ہے یہاں آبروئے بامِ حرم
کس نہ دانست کہ من نیز ہائے دارم

آں متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں

☆☆☆

قندِ مکرر

اک رازِ محبت تھا جو کہہ گیا دیوانہ
وہ دین ہو یا دنیا، ہر چیز ہے افسانہ
ہاں ہمتِ مردانہ، اک نعرۂ مستانہ
فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بت خانہ
ایں جلوتِ جانانہ، آں خلوتِ جانانہ

احساسِ محبت ہے اس وقت کچھ افزوں تر
اے پیرِ مغاں کر دے لبریز مرا ساغر
تُو ساتھ اگر ہو تو تنہائی کا پھر کیا ڈر
از بزمِ جہاں خوشتر، از حورِ جناں خوشتر
یک ہمدمِ فرزانہ با بادہ و پیمانہ

مانا کہ مرے دل پہ اب ہے ستم بے حد
لیکن ہے دبستانِ اُلفت کی تو یہ ابجد
بس میں ہی اُسے دیکھوں، کیوں ہو مجھے یہ کد
ہر کس نگہے دارد، ہر کس سخنے دارد
در بزمِ تو می خیزد افسانہ ز افسانہ

ہم اشک کا طوفاں ہیں سینے میں لیے بیٹھے
واللہ محبت کے آثار نہیں اچھے
کوئی مجھے جتلائے، یوں لوٹ لیا کس نے
ایں کیست کہ بر دلہا آوردہ شبے خونے

صد شہر تمنا را یغما زدہ ترکانہ

مشہور ہے دنیا میں "ہر کارے و ہر مردے"
"دارد بہ خیال خود ہر شخص جدا خبطے"
جو نعرۂ اکبر ہے وہ بھی تو ذرا سن لے
در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

☆☆☆

روحِ قرآنی

وہی جو رکھتا ہے بادہ نہ جام رکھتا ہے
نہ قوتِ زر و تیغ و حسام رکھتا ہے
نہ قہر و زورِ نریمان و سام رکھتا ہے
کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہو بے پردہ روحِ قرآنی

مری نظر سے ذرا دیکھ دل کشی اپنی
نہ جانی قدر کبھی تو نے واقعی اپنی
نہ تو نے پی کبھی صہبائے زندگی اپنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

خدا کے واسطے پی جلد پی کہ آئی بہار
فروغِ لالہ و گل دیکھ، سن نوائے ہزار
اُٹھا نگاہ کہ اب غنچہ غنچہ ہے بیدار
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی

وہی مقام جہاں زندگی برتی ہے
وہی مقام جو یکسر فراغ دستی ہے
وہی مقام جو نا آشنائے پستی ہے
یہ جبر و قہر نہیں ہے، یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی

نہیں ہے یاد مگر عہدِ ارتقا تجھ کو
لیے تھی گود میں جب رحمتِ خدا تجھ کو
خبر بھی ہے تجھے اب ہو گیا ہے کیا تجھ کو
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

میں پوچھتی ہوں کہ کم تھا جہاں میں تُو کس سے
وہ جھک گیا ترے آگے ملا تو جس تس سے
نظر لڑاتا تھا گلشن میں چشم نرگس سے
ہوا حریفِ مہ و آفتاب تُو جس سے
رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ مسلمانی

خوشا وہ دن کہ جدا سب سے تھا ترا مسجود
بہت بلند زمانہ سے تھا ترا مقصود

سوا خدا کے نہ تھا کوئی بھی ترا معبود
مثال ماہ چمکتا تھا جس کا داغ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

☆☆☆

فکرِ راہ

نہیں طلب ہی تجھے فکرِ راہ کیوں ہوتی
یہ کیا غضب ہے تری رُوح اب بھی ہے سوتی
حقیر شے ہے اگر داغ دار ہے موتی
یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ جانتی ہوں کہ ہے ذرہ پیکرِ نور
مگر خطا ہے مری یا تری نظر کا قصور
کہ آج تک نہ مجھے مل سکا خدا کا حضور
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کی نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

فریب حسن مجازی سے بے خبر ہشیار
سمجھ رہا ہے جسے پھول ہیں یہ آتش و خار
کھلے نہ تجھ پہ مگر زندگی کے یہ اسرار
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اگر یہی ہے ترا ولولہ تو کیا حاصل
جو ہے نظر کا یہی منتہا تو کیا حاصل
زباں نے تیری پکارا خدا تو کیا حاصل
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت بلند ہے دنیا سے آرزو میری
حریم قدس کو چھوتی ہے جستجو میری
جدا ہے شیوۂ اہل جہاں سے خُو میری
عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح، پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

☆☆☆

نوائے سوز

بتاؤں کیا کہ مسلط ہے مجھ پہ کون سا غم
نہ ہم صفیر کوئی ہے نہ کوئی ہے ہمدم
سناؤں اب میں کسے اپنی داستانِ الم
ہنوز ہم نفسے در چمن نمی بینم
بہار می رسد و من گلِ نخستینم

میں جانتا ہوں کہ ممکن نہیں مٹے یہ اَلم
نہیں ہے اب کوئی اُمید، دُور ہو یہ غم
پہ اس لیے کہ بہل جائے دل میرا کوئی دم
بہ آب جو نگرم خویش را نظارہ کنم
بہ ایں بہانہ مگر روئے دیگرے بینم

کدھر ہیں آئیں ادھر جو ابھی نہیں بد مست
چمن میں آج ہوں اک میں ہی جام بادہ بدست
چلو چلو کہ لنڈھاتا ہوں میں شراب الست
بجلوہ کہ خط زندگی رقم زدہ است
نوشتہ اند پیامے بہ برگ رنگینم

جنونِ شوق میرا بڑھ رہا ہے روز بروز
شروعِ عشق ہے لیکن بہت سبق آموز
ہے میرے سازِ جنوں میں نکلا کی گرمی سوز
دلم بہ دوش نگاہم بہ عبرتِ امروز

شہیدِ جلوۂ فردا و تازہ آئینم

خبر نہیں کہ سمجھتی ہے کیا مجھے شبنم
صبا و خار میں سرگوشیاں ہیں کیا باہم
مرے وجود کا ہے راز صرف یہ ہمدم
ز تیرہ خاک دمیدم قبائے گل بستم

وگرنہ اختر واماندۂ ز پروینم

☆☆☆

مرغِ نواطراز

اے کہ حیاتِ بخش ہے میرے لیے تیری صدا
خلوتیانِ راز کو بہر خدا کہیں بلا
خستہ و مضطرب رہے تا بکے جان جتلا
خیزد نقاب برکشا پردگیانِ راز را
نغمۂ تازہ یاد دہ، مرغِ نوا طراز را

رہنے دے مجھ کو مضطرب مجھ کو سکون ہے ناگوار
تو یونہی نغمہ سنج رہ صورتِ جوے کوہسار
تیری نوائے درد پہ دولتِ دو جہاں نثار
جادہ ز خونِ رہرواں تختۂ لالۂ بہار
ناز کہ راہ می زند قافلۂ نیاز را

بہر خدا لٹا بھی دولتِ دردِ عاشقی
مالکِ صد بہار ہے تجھ کو نہیں کوئی کمی
مان لے میرا یہ کہا، سن لے یہ التجا مری
دیدۂ خوابناک او، گر بہ چمن کشودہ ای
فرصت یک نظر بدہ، نرگس نیم باز را

میرے جنوں میں بھی نہیں گرچہ زیادہ شد و مد
اور مجھے نہیں ہے کچھ اہلِ خرد سے بھی حسد
یہ بھی نہیں مگر کہ میں جانوں نہ فرقِ نیک و بد
گرچہ متاعِ عشق را عقل بہائے کم نہد

من نہ دہم بہ تختِ جم آہِ جگر گداز را

میرے لیے تو ہے تری مہرِ سکوت بھی نشید
تیرا اشارۂ نظر میرے لیے پیامِ عید
جن میں نہیں ہے تابِ ضبط ان کو مگر نہ کر مرید
حرفِ نگفتۂ شما بر لبِ کو دکاں رسید

از منِ بے زباں بگو خلوتیانِ راز را

کیا میں بتاؤں حسن کا ہوتا ہے دل پہ کیا اثر
تاک لے جس کو ایک بار اس کو کہیں نہیں مفر
اخترِ راز آشنا کس کو سنائے یہ خبر
برہمنے بہ غزنوی گفت کرا تم نگر

تو کہ صنم شکستۂ بندہ شدی ایاز را

☆☆☆

شاعر اور حور

حور:

مری سمت کیوں نہیں ہے تیرا التفات شاعر
مری جنتِ حسیں میں ہے تری نجات شاعر

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو نہ دانی رہ و رسم آشنائی

نہیں قدر تجھ کو اصلاً مرے عشوۂ و ادا کی
ترے سینۂ تپاں میں یہ تڑپ ہے کس بلا کی

ہمہ ساز جستجوئے ہمہ سوز آرزوئے
نفسے کہ می گدازی، غزلے کہ می سرائی

مگر آہ اب میں سمجھی کہ جہاں ہے تجھ سے قائم
ترا نغمہ جادواں ہے ترا شعر نقشِ دائم

بہ نوائے آفریدی چہ جہانِ دل کشائی
کہ ارم بہ چشم آید چو طلسم سیمیائی

شاعر:

ہیں اگرچہ جان لیوا ترے حسن کے نظارے
مری زندگی مگر ہے غم عشق کے سہارے
ہیں بَلا کے ہوش افگن ترے آنکھ کے اشارے
دل رہرواں فریبی، بہ کلام نیش داری
مگر ایں کہ لذت او نہ رسد بنوکِ خارے

میں ہوں شاعر محبت مجھے تجھ سے کیا بھلا کد
مگر آہ کیا کروں میں غم دل مرا ہے بیحد
تری آرزو کو کرتا نہ کسی طرح سے میں رد
چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نہ سازد
دل نا صبور دارم، چو صبا بہ لالہ زارے

مرا دل سحابِ غم ہے مگر آہ کیسے برسے
یہ محال ہے کہ طوفاں کوئی چشمِ تر سے اُٹھے
میں تجھے بتاؤں کیوں کر مرے ولولے ہیں کیسے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بہ میرم از قرارے

دلِ من اگرچہ نزد تو اذیتے نہ دارد
دلِ من اگرچہ نزد تو حقیقتے نہ دارد
گر ایں نہ راست باشد کہ نصیحتے نہ دارد
ظلم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد

بہ نگاہ نا شکیبے بہ دلِ اُمیدوارے

یہ نہیں ہے تیرے بس میں کہ حقیقتوں کو جانے
تجھے کیا خبر کہ کیا ہیں غم عشق کے فسانے
میں یہی کہوں گا لیکن کوئی مانے یا نہ مانے
دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے

نہ نوائے درد مندے، نہ غمے، نہ غمگسارے

☆☆☆

نئے دَور کا آغاز

اوروں کی طرح میں بھی گمراہ و لیکن
رہرو ہوں، نہیں کچھ طلبِ راہ و لیکن
بے نور ہے راتوں کا مرے ماہ و لیکن
میں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ و لیکن
اربابِ نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز

کیا حشر زمانہ میں ہے اُس کا جو نہیں بد
دنیا میں سہے جائے گا تو کب تک ستم بے حد
اسلام سے لینا نہیں تو ہو بھی جا مرتد
کر تُو بھی حکومت کے درندوں کی خوشامد
دستور نیا اور نئے دَور کا آغاز

معلوم نہیں ہے یہ عداوت کہ محبت
معلوم نہیں ہے یہ سعادت کہ شقاوت
معلوم نہیں ہے یہ بغاوت کہ اطاعت
معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت
کہہ دے کوئی اُلّو کو اگر رات کا شہباز

سیّدہ اختر واقبالؔ

تجسس کے رنگین نشاں اور بھی ہیں
ترے منتظر کارواں اور بھی ہیں
مکاں اور بھی لا مکاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

نہیں جستجو کی یہاں انتہا ئیں
نہ کیوں اپنے ذوقِ طلب کو بڑھائیں
اُٹھو اب حجاباتِ عالم اُٹھائیں
تہی زندگی کی نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

ہر اک ذرّہ دردِ تمنا سے مضطر
ہر اک گام ہے تازہ سامانِ محشر
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
نگاہوں سے پوشیدہ لاکھوں ہیں منظر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر چاک ہے گُل کا دامن تو کیا غم
ہے نذرِ خزاں تیرا گلشن تو کیا غم
اگر چھن گیا تیرا مامن تو کیا غم
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

ہر اک سانس ہے ایک الہام تیرا
ستاروں سے آگے ہے پیغام تیرا
غرض عرش پیما ہے انجام تیرا
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

کبھی تُو بھی دیکھ آپ اپنا تماشہ
نہیں ہے یہیں ختم تیری یہ دنیا
نہ کر تنگ تُو اپنا دامِ تمنا
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

نیا عندلیب آیا ہے پھر چمن میں
یہی ذکر ہوتا ہے اہلِ سخن میں

سنو نغمہ اختر کا بزم وطن میں
گئے دن کہ اقبال تھا انجمن میں
حقیقت کے اب راز داں اور بھی ہیں

☆☆☆

فرمانِ ابلیس

(اپنے فرزندوں کے نام)

لاؤ ہر اک جلوہ کو ظلمت کے بیچ میں
اہلِ خرد کو ڈالو حماقت کے بیچ میں
پھانسو ہر ایک دل کو محبت کے بیچ میں
لا کر برہمنوں کو سیاست کے بیچ میں
زُنّاریوں کو دَیرِ کہن سے نکال دو

وہ مدعی عزم کہ ہے جس کو حوصلہ
وہ مدعی اوج کہ ہے جس میں ولولہ
وہ مسلماں کہ جس کو خدا کا ہے آسرا
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

دنیا تمھارے دم سے رہے وقفِ حادثات
ہر غزنوی کے دل میں ہے لیلائے سومنات
اہلِ عجم کو کر کے اسیرِ توہمات
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

کرنے دو ان کو کرتے ہیں جو لوگ احتجاج
لے لو جہاں سے فتنہ و ہنگامہ کا خراج
قدموں میں ڈال دو مرے ہر حکمراں کا تاج
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

مسلم سے خوئے رسم مساوات چھین لو
جو قوم اُٹھے اُس سے موالات چھین لو
انساں سے وصف خلق و مدارات چھین لو
اہل حرم سے اُن کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو

ہر شاخ شاخ تاک ہے، ہر غنچہ بادہ ریز
ہر برگ سبز اب نظر آتی ہے تیغ تیز
اختر کی فکر نو سے ہے ذروں میں جست و خیز
اقبال کی نوا سے ہے لالہ کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

☆☆☆

ماہِ تمام

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا ہے مرے دل کا عالم
حسرتِ دید سے کھنچ آیا ہے اب آنکھ میں دم
تھا بہت ضبط مگر کھل ہی گیا اس کا بھرم
حسرتِ جلوۂ آں ماہ تمامے دارم
دست بر سینہ، نظر بر لب بامے دارم

میں مگر جانتی ہوں مجھ پہ جو ہوتے ہیں ستم
درد یکساں ہے مرے دل میں نہ کچھ بیش نہ کم
دن جدائی کا ہو یا ہجر کی شب کیا ہے غم
حسن می گفت کہ شامے نہ پذیرد سحرم
عشق می گفت تب و تاب دوامے دارم

آج تو سینہ کے اندر ہے قیامت کا خروش
ہو سکے گا نہ کبھی سازِ تمنا خاموش
بے خودی چاہیے مجھ کو نہیں درکار ہے ہوش
نہ بہ امروز اسیرم نہ بہ فردا نہ بدوش
نہ نشیبے نہ فرازے نہ مقامے دارم

کاش یوں بھی ہو کہ سامان جنوں کا ہو بہم
مجھ کو مل جائیں کہیں رمز شناسانِ اُمم
اور سناؤں انھیں میں بیٹھ کے افسانۂ غم
بادۂ رازم و پیمانہ گسارے جویم
در خراباتِ مغاں گردش جامے دارم

کہہ دو مل جائے اگر تم کو کوئی اہلِ نظر
یہ صدائے دلِ دیوانہ ہے اس سے کیا ڈر
یہ نوا ہائے حقیقت ہیں نہ کر ان سے حذر
بے نیازانہ ز شوریدہ نوایم مگذر
مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم

آج شیرازۂ عالم ہے نہایت برہم
جانِ مسلم پہ ستم ٹوٹ رہے ہیں پیہم
وقت ہے اخترِ خوش گو کی سنے تو ہمدم
پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم
تیغ خوں ریزم و خود را بہ نیامے دارم

☆☆☆

موصوفہ نہ صرف نظم نگاری و غزل گوئی پر پوری قدرت رکھتی ہیں بلکہ نثر میں بھی ان کے مضامین کا معیار فکر و نظر بہت بلند اور وسیع ہے۔ وہ صرف قافیہ اور ردیف کی تعریف نہیں کرتیں بلکہ حقیقتاً واردات قلبیہ ہوتی ہیں جو قوائے شعریہ سے متصل ہو کر از خود صورت شعری اختیار کر لیتی ہیں۔

---جگر مرادآبادی

اختر صاحبہ کی شاعری میں تصنع مطلق نہیں پایا جاتا۔ وہ جو کچھ بھی محسوس کرتی ہیں اس کو شعر کا پیکر دے دیتی ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ غزل کہتے ہیں۔ وہ نظم نہیں کہہ سکتے اور جو نظم پر قادر ہوتے ہیں انھیں نثر پر قدرت نہیں ہوتی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اختر صاحبہ غزل نظم اور نثر ان تینوں اصناف پر قادر ہیں اسی کے ساتھ ساتھ ایک خاص دلکشی اور کلام کی صفت ان میں اور بھی ہے یعنی وہ ایک نہایت شیریں بیان اور جذبات انگیز خطیبہ بھی ہیں۔

---جوش ملیح آبادی

---ایک خادم ادب اور شاعر ہونے کی حیثیت سے تمام اراکین و شرکا، کانفرنس کی خوشی سے اس بھری محفل میں سیدہ اختر صاحبہ کو "زہرہ سخن" کا تابناک خطاب دیتا ہوں جس کی وہ حقیقی معنوں میں مستحق ہیں۔

---سیماب اکبرآبادی

اختر کی غزل میں جدید تغزل کے قریب قریب تمام رجحانات پائے جاتے ہیں۔ الفاظ کو اپنا محل اور موقع سے برتنے کا بھی ان کو سلیقہ ہے۔ مفہوم ادا کرنے پر ان کو پوری قدرت حاصل ہے۔ اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس دور کے بے راہرو شاعروں کی طرح نامانوس متعلق خود تراشیدہ ترکیبوں سے ان کی غزلیں پاک ہوتی ہیں۔

---ماہر القادری

یہ اوراق سیدہ اختر کے ان افکار کے حامل ہیں کہ اگر ان کی معنویت کو سامنے رکھ کر کوئی شخص ان پر کاربند ہو تو وہ خود بھی سیدہ اختر کی طرح اپنے سینہ کو جوش اسلام سے معمور پا سکتا ہے۔ اقبال کا کلام اور خطیہ بندی کی تضمینیں سونے پر سہاگہ، شاید ایسے ہی موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ---نیاز فتحپوری

جوش ملیح آبادی کا ساغر جگر مرادآبادی کا پیمانہ اور ماہر القادری حیدرآبادی کا جرعہ رنگیں پئیں اور پینے کے بعد ایمانداری کے بعد دور کے اس فیصلہ کی تائید فرمائیں کہ سیدہ اختر زمانہ حاضر کی بہترین شاعرہ ادیبہ اور مقررہ ہیں؟

---دور ہاشمی

تضمینات اقبال کے ضمن میں تخلیقی سطح پر ایک نمایاں اور منتخب مثال اقبال کی ایک قریبی معاصر اور ان کی ایک پرستار سیدہ اختر حیدرآبادی کی ہے، جن کی تخلیق کردہ تضمینات اقبال کا ایک مکمل مجموعہ: "اختر و اقبال، یعنی تضمین بر کلام اقبال" ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ---معین الدین عقیل

ڈیزائن: اویس سہروردی

دارالنعمان پبلشرز
DARUN NOMAN PUBLISHERS